POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 February 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

ہفت روزہ
ہماری زبان
HAMARI ZABAN
(Weekly)
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 23-02-2026 • Price: 5/- • 1-7 March 2026 • Issue: 9 • Vol:85

یکم تا ۷/مارچ ۲۰۲۶ء • شمارہ:۹ • جلد:۸۵

دارالمصنّفین اور بھوپال

سو سالہ رشتے کے تناظر میں

عارف عزیز

وسط ہند کی نسبتاً ایک چھوٹی ریاست بھوپال اپنے جاے وقوع اور چار نسلوں تک جاری رہنے والی بیگمات کی حکمرانی نیز اُن کی معارف نوازی کے باعث ہندستان میں ایک منفرد مقام کی حامل رہی ہے۔ ریاست کی آخری بیگم نواب سلطان جہاں (1930-1885) نے بھی خاندانی علم دوستی کی اِس روایت کی توسیع کرتے ہوئے قومی و علمی اداروں کی اِس حد تک سرپرستی فرمائی کہ کوئی بڑا ادارہ ایسا نہ رہا، جو بیگم صاحبہ کے چشم فیض سے سیراب نہ ہوا ہو، وہ بانی دارالمصنّفین اعظم گڑھ علامہ شبلی نعمانی (1914-1857) کی عبقری شخصیت و علمی خدمات سے حد درجہ متاثر تھیں اور اُن کے ساتھ لطف و کرم کا سلوک اور علمی کاموں میں سرپرستی فرماتی تھیں۔ علامہ شبلی کی سلطان جہاں بیگم سے 1905 میں پہلی ملاقات ہوئی تو شبلی اِتنے متاثر ہوئے کہ 'الندوہ' میں ان کی قومی خدمات پر ایک مضمون سپرد قلم کیا۔ عقیدت کا یہ تاثر اُس وقت مزید گہرا ہوگیا، جب شبلی نے 'سیرت النبیؐ' کی تالیف کا عزم کرکے قوم سے اُس کے ماہانہ مصارف اور مآخذ کی کتب خریدنے کے لیے مالی امداد کی درخواست کی۔ سلطان جہاں کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے محکمہ تاریخ کے مہتمم منشی محمد امین زبیری (1958-1868) کے مشورے پر 'سیرت النبیؐ' کے جملہ مصارف کی ذمہ داری قبول کرکے دوسری تمام امدادوں سے شبلی کو بے نیاز کردیا اور حکم صادر فرمایا:

''چوں کہ اردو میں اِس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مفصل اور مستند سوانح عمری موجود نہیں تھی، اِس لیے جب مجھے معلوم ہوا کہ شمس العلماء مولانا شبلی جو تاریخِ اسلام کے ایک باکمال اور مستند مورخ ہیں، سیرت النبیؐ مرتب کرنا چاہتے ہیں، لیکن مالی امداد سے مجبور ہیں اور انھوں نے امداد کی ایک اپیل شائع کی ہے، میں نے اس اپیل کو دیکھا اور افسوس ہوا کہ ایسی ضروری مذہبی تصنیف کے لیے پبلک سے اپیل کرنے کی نوبت پہنچی ہے۔ میں نے اُن کو مطلع کیا کہ فوراً کام شروع کردیں، جس قدر روپے کی اپیل کی گئی ہے، وہ میں دوں گی، لیکن اپیل میں اُن کتابوں کا ذکر نہیں جو تالیف میں ضروری تھیں۔ جب حمید اللہ خاں (بیگم صاحبہ کے چھوٹے صاحبزادے) کو یہ ضرورت معلوم ہوئی تو انھوں نے اس ثواب میں حصہ لینے کے لیے فوراً دو ہزار روپے مزید کتب کے لیے مولانا کے پاس بھیج دیے اور اجازت دی کہ جس قدر کتابوں کی ضرورت ہو وہ بھی خرید لی جائیں، اس کی قیمت ادا کردی جائے گی۔''

اِس فیاضانہ پیش کش کا علامہ شبلی نے بڑی مسرت کے ساتھ اپریل 1912 کے 'الندوہ' میں ان الفاظ کے ساتھ اعلان کیا:

''مجلس تالیف سیرتِ نبوی نے چندوں کی وصولی کرنے کی جن تدابیر کا اعلان کیا تھا، ایک زبیدۂ وقت نے اِن سب کو منسوخ کردیا اور تمام وصول، شدہ چندے واپس کردیے گئے۔''

''بیگم بھوپال کی طرف سے دوسو روپے ماہوار مقرر ہوئے تو مصارف کی جانب سے مطمئن ہوکر شبلی ہمہ تن سیرت کی تالیف میں مصروف ہوگئے۔''

(مولانا شاہ معین الدین ندوی-'دارالمصنّفین اور ریاست بھوپال'، سہ ماہی 'فکر و آگہی' دہلی 'بھوپال نمبر' شمارہ 10، 11 اور 12، 1996)

درج بالا عبارت کی علامہ شبلی کے اِن اشعار سے بھی تصدیق ہوتی ہے:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں، میں بہر صورت
کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید، روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے، مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں، اِس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اِک فقیر بے نوا ہے، ایک سلطاں ہے

(کلیاتِ شبلی اردو، ص 112)

لکھنؤ کا ماحول و موسم شبلی کے لیے پُرسکون نہیں تھا، اِس لیے سیرت کی تالیف کی خاطر بمبئی کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر عزلت گزیں ہونا چاہتے تھے۔ اُنھیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ خرچ تخمینے سے بڑھ جائے گا، مئی کے آخر میں بمبئی جاتے ہوئے راستے میں بھوپال اتر پڑے اور مولوی عبدالرزاق مصنّف البرامکہ کا بیان ہے کہ بیگم صاحبہ سے ملاقات کرکے اپنا یہ قطعہ پڑھا:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ
خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

'سرکارِ عالیہ اِس قطعے کو سن کر بے حد متاثر ہوئیں اور فرمایا، آپ مطمئن رہیں، جو مصارف ہوں گے میں دوں گی اور اِس کے متعلق حکم صادر فرمایا اور مولانا سے کہا کہ میں نے اپنا فرض ادا کردیا اور یقیناً اس ثواب کی مستحق ہوگئی جو اِس نیک کام کے بدلے مجھے ملے گا۔ آپ کی صحت تو اِتنی خراب ہے کہ دو وقت کھانا نہیں کھاتے۔ آپ نہ رہے تو کتاب کیوں کر پوری ہوگی۔ مولانا نے جواب دیا کتاب ضرور پوری ہوگی۔ میں نے دو آدمی تیار کرلیے ہیں، حمیدالدین اور سید سلیمان پوری کریں گے۔' (سہ ماہی 'فکر و آگہی' ایضاً)

'ایک طرف علامہ شبلی کا یہ عزم بالجزم تھا، دوسری جانب اُن کے روایتی حریف سرگرم تھے کہ سیرت کو کسی صورت چھپنے نہیں دیں گے لہٰذا سیرت کی پہلی جلد مکمل ہوگئی تو اُس کے چھپنے کے مشورے ہونے لگے، اِسی درمیان میں سیرت کا مقدمہ قلم بند ہوگیا۔

'مولانا ابوالکلام آزاد کو اِسے مطالعے کے لیے بھیجا تو اُنھوں نے 'الہلال' کلکتہ میں چھاپ دیا تاکہ اہلِ نظر دیکھ سکیں کہ کتاب کس درجہ تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے، لیکن بعض مخالفین، جن کو یہ گوارہ نہ تھا کہ سرکارِ عالیہ کی سرپرستی میں سیرت النبی لکھی جائے، انھوں نے اعتراضوں کی بوچھار کردی اور ایڈیٹر 'الجمعیۃ' لکھنؤ نے اس پر نہایت سخت تنقید شائع کردی، جو سرکارِ عالیہ تک پہنچائی گئی اور معاملے نے اتنا طول پکڑا کہ علامہ شبلی بددل ہوکر وظیفۂ بھوپال سے خود دستبردار ہونے پر تیار ہوگئے۔ اس قضیے کا یہ اثر مرتب ہوا کہ سیرت کی ابتدائی دو جلدیں مکمل ہونے کے باوجود علامہ کی زندگی میں شائع نہیں ہوسکیں اور وہ سیرت کی ناتمامی کا داغ دل میں لے کر 18 نومبر 1914 کو دنیا سے رخصت ہوگئے۔'

(سید سلیمان ندوی 'حیاتِ شبلی' صفحہ 17-716)

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

اِس سانحے کی خبر ملی تو بیگم صاحبہ نے بہ حسرت فرمایا کہ 'فقیر بے نوا تو چل بسا، سلطان باقی ہے' علامہ کی وفات کے بعد جب اُن کے تجویز کردہ نقشے کے مطابق سیرت اور دوسرے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے دارالمصنّفین قائم ہوا تو ریاست بھوپال کی طرف سے سیرت کی اشاعت کے لیے ملنے والی مالی امداد دارالمصنّفین کو منتقل ہوجائے، اس کے لیے ادارے کے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی (1953-1884) نے سلسلۂ جنبانی شروع کی، بھوپال ریاست کے پولیٹکل ایجنٹ لفٹنٹ کرنل سی ای لوارڈ (LUARD) امداد جاری کرنے پر اس لیے معترض تھے کہ دارالمصنّفین شبلی اکادمی کے ناظم مولانا سیّد سلیمان ندوی اور منیجر مولوی مسعود علی تحریکِ خلافت سے وابستہ ہیں اور ادارے کے ترجمان 'معارف' میں خلافت تحریک پر مضامین کی اشاعت ہورہی ہے۔

عہدِ سلطانی کی اِس کارروائی پر مشتمل 1922 کی ایک فائل پولیٹکل ڈپارٹمنٹ بھوپال ریاست نمبر 103 بنڈل نمبر 75 برائے دریافت حالات شبلی اکادمی بمقام اعظم گڑھ کے حوالے سے نیشنل آرکائیوز ریجنل آفس بھوپال میں محفوظ ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پولیٹکل ایجنٹ ریاست بھوپال سے دارالمصنّفین کو مالی امداد کی فراہمی کے حق میں نہیں تھا، اُس نے 17 مارچ 1921 کو ریاست کے چیف سکریٹری حمیداللہ خاں کو خط لکھ کر دارالمصنّفین کی مالی امداد کے بارے میں تفصیلات طلب کیں، اس کے جواب میں بھوپال ریاست کے مہتمم تاریخ منشی امین زبیری نے وضاحت کی کہ اکادمی کی مجلس کو ملک کے سیاسی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ایک خالص علمی ادارہ ہے، جس کے ارکان علمی تصنیفات و مقالات خصوصاً سیرت النبیؐ کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ اس کے ساتھ سالِ گذشتہ (1921) کی دارالمصنّفین سے موصول تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی گئی، جس میں درج ہے:

''مذکورہ مجلس کو سیاسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ مسئلہ خلافت کی تاریخی و مذہبی حیثیت پر بعض اصحاب نے مضامین شائع کیے ہیں اور مولوی سیّد سلیمان صاحب ناظم ذاتی طور پر گذشتہ سال (1920) خلافت ڈپوٹیشن کے ممبر کی حیثیت سے یوروپ گئے تھے اور مولوی مسعود علی صاحب خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہیں، اُن چند اصحاب نے جن کا تعلق دارالمصنّفین سے ہے مسئلہ خلافت میں جس قدر تحریر و تقریر کے ذریعے حصہ لیا، وہ اپنی پرائیوٹ پوزیشن میں ہے، دارالمصنّفین شبلی اکادمی کے لحاظ سے نہیں اور نہ ادارے کا ان تحریکات سے کوئی تعلق ہے۔ ادارے کے ارکان میں زیادہ ایسے اصحاب ہیں، جو گورنمنٹ کے مقاصد کے برخلاف کسی قسم کی تحریک میں دلچسپی نہیں رکھتے، مثلاً نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد، مولوی ضیاء الحسن علوی انسپکٹر مدارس عربیہ، مولوی مہدی حسن تحصیلدار منصف کانپور، منشی امین زبیری مہتمم تاریخ بھوپال۔'' (فائل نیشنل آرکائیوز سے)

اِس کے ساتھ روداد مجلس دارالمصنّفین (پروگریسیو رپورٹ) بابت 1920 منسلک کی گئی، جس میں یہ عذر بھی شامل ہے:

'اِس سال ناظم کے ملک سے باہر رہنے سے علمی کام کی رفتار تیز نہیں رہی تاہم سیرت النبیؐ کی دوسری جلد کی اشاعت کا کام ہوا اور تیسری جلد جس میں معجزات کا حصہ ہے، جلد مطبع جانے کے لیے تیار ہے اور حصہ چہارم منصب نبوت قریبِ تکمیل ہے 'تاریخِ اسلام' کا کام بدستور جاری ہے۔ امسال خلفائے عباسیہ کے زمانے تک کا حصہ مکمل ہوگیا ہے، مولوی سعید انصاری اِس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ 'شعر الہند' کے لیے بہت سے قلمی تذکروں اور شعرا کے دواوین کی ضرورت ہے، جو لوگوں کے پاس متفرق طور پر موجود ہیں۔ اس کا بڑا حصہ مولوی عبدالسلام نے مرتب کیا ہے اور تھوڑا حصہ زیرِ تحریر بھی لا چکے ہیں۔ 'رقعاتِ عالمگیری' میں جمع و ترتیب کی پیش رفت جاری ہے۔'' (فائل نیشنل آرکائیوز سے)

اس روداد میں دارالمصنّفین کے علمی ترجمان ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ، جس کو مولوی عبدالماجد دریابادی ایڈیٹ کررہے تھے، اُس کی تفصیلات بھی درج کی گئیں، اس کے علاوہ دارالمصنّفین کے شعبے دارالاشاعت، دارالکتب، تعمیرات، مجلسِ انتظامی کی صورتِ حال سے بھی روشناس کرایا گیا۔ رپورٹ میں ادارے کے عہدیداران و ارکان کے نام اور مشاہرے کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

اِس کے ہمراہ تین صفحات کا ایک خوش خط عریضہ مہتمم دفتر تاریخ منشی محمد امین زبیری کے قلم سے تحریر بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کرکے دارالمصنّفین کے علمی کاموں کا مزید تعارف کرایا گیا، نیز یہ بھی وضاحت کی گئی کہ سیاسی امور سے ادارے کو کوئی نسبت نہیں اور جن ارکان نے تحریک خلافت میں حصہ لیا، وہ نجی حیثیت سے تھا۔ جولائی 1921 سے فروری 1922 تک 'معارف' میں شائع مضامین کی فہرست پیش کرکے وضاحت کی گئی کہ ان میں مسئلہ خلافت پر چند مضامین ضرور ہیں، لیکن صرف تاریخی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

آرکائیوز میں محفوظ دارالمصنّفین کے بارے میں دستاویز کی اس فائل میں بیگم صاحبہ کے صاحبزادے حمیداللہ خاں کا ایک خط 8 جون 1922 کا پولیٹکل ایجنٹ کے نام ہے، جس میں صراحت کی گئی کہ دارالمصنّفین کے بارے میں مالی امداد کا فیصلہ ابھی زیرِ غور ہے، اس کے بعد 15 جولائی 1922 کو بیگم بھوپال کا صادر کیا ہوا وہ حکم نامہ ہے، جس میں سرکار عالیہ نے دارالمصنّفین کو وظیفہ جاری کرنے کے ساتھ پابند کیا کہ بھوپال ریاست سے ملنے والا وظیفہ دوسرے مقاصد میں استعمال نہیں ہوگا، صرف سیرۃ النبیؐ کی تیاری میں صرف ہوگا۔ یہ مکمل فائل نو صفحات پر مشتمل ہے۔

مالی امداد کے فیصلے کے بعد بیگم صاحبہ نے مولانا حمیدالدین اور سیّد صاحب کو بھوپال بلا کر فرمایا کہ اطمینان کے ساتھ کام جاری رکھا جائے، جس امداد کی ضرورت ہوگی دی جائے گی۔ اِس طرح سیرت کی امداد دارالمصنّفین کی جانب منتقل ہوگئی۔ بعد کی ملاقات میں سید صاحب نے سلسلہ سیرت کی دوسری کتابیں بالخصوص 'سیرت عائشہ'، 'سیر الصحابہؓ' اور 'سیر الصحابیات' کے بارے میں بیگم صاحبہ کو بتایا کہ یہ لکھی جا چکی ہیں، لیکن طباعت کا سامان نہ ہونے سے نہیں چھپ سکتیں، اس کے لیے پریس کی ایک مشین کی ضرورت ہے، جو تین ہزار میں ملے گی، بیگم صاحبہ نے جواب میں فرمایا:

''ایسے کام کے لیے تین ہزار کیا چیز ہے اور اُسی وقت حکم صادر فرمایا۔ تین ہزار روپے مولوی سید سلیمان ندوی کو بشکریہ سیرت النبیؐ دیے جائیں تاکہ ایسے کتب ہائے خیر کا سلسلہ جاری رہے اور قوم اِس سے استفادہ کرے، اِس رقم سے مشین خریدی گئی اور معارف پریس قائم ہوا، جس سے کتابوں کی طباعت میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی، اِس طرح بیگم صاحبہ کی فیاضی سے دارالمصنّفین کی بنیاد پڑی۔ اُن کے صاحبزادے نواب حمیداللہ خاں نے بھی اپنے عہد میں یہ امداد جاری رکھی جو ریاست کے خاتمے تک ملتی رہی''۔

(سہ ماہی 'فکر و آگہی' دہلی، ایضاً)

مذکورہ تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سیّد سلیمان ندوی کی زندگی کے بڑے اور بیش قیمت حصے کی تحقیقی و علمی کاوشوں کا نچوڑ سیرت النبی کی چھ جلدیں اور سلسلۂ سیرت کی دوسری کتابیں شائع نہیں ہوتیں اگر ریاست بھوپال فراخ دلی کے ساتھ 35 برس تک مالی امداد فراہم نہ کرتی۔ یہ وہ کارنامہ ہے جو علمی حلقوں میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیرت النبیؐ کی تکمیل اور دارالمصنفین کی تاسیس میں بھوپال کا خصوصی حصہ ہے۔

دارالمصنّفین اور بھوپال کے اِس تعلق کو استحکام بخشنے والی دوسری شخصیت نواب سید علی حسن خاں (1866-1936) فرزند نواب صدیق حسن خاں ہیں، علامہ شبلی، سرسید علیہ الرحمہ کے ہمراہ 1891 میں پہلی مرتبہ بھوپال آئے تو نواب علی حسن کے مہمان بنے۔ وقت کے ساتھ یہ تعلق اتنا مستحکم ہوگیا کہ علامہ متعدد بار نواب صاحب کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے۔ تحریک ندوہ کے دوران نواب علی حسن کا لکھنؤ میں قیام تھا، اُس وقت بھی دونوں کی ملاقاتیں جاری رہیں، نواب صاحب نے علامہ شبلی کے 'حادثۂ گزند پا' پر ایک قطعہ بھی لکھا، دارالمصنّفین کے قیام کے بعد جب مجلس تاسیسی تشکیل پائی تو نواب صاحب اُس کے رکن بنائے گئے۔

بھوپال کی تیسری شخصیت منشی محمد امین الدین زبیری (1868-1958) کی ہے، جو مہتمم محکمہ تاریخ کی حیثیت سے ریاست بھوپال میں شائع ہونے والی تصانیف کے بارے میں شبلی سے مشورہ لیتے تھے، وہ بیگم بھوپال اور علامہ شبلی کے درمیان سفارت کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ شبلی سے اُن کے تعلق کا اندازہ اُن اکتیس خطوط سے ہوتا ہے، جو اُن کے نام تحریر کیے گئے۔ یہ بھی دارالمصنّفین کے رکن رہے، لیکن علامہ شبلی کے انتقال کے بعد اُن کے بارے میں ایک غیر شائستہ مضمون لکھنے کے بعد منشی زبیری کی رکنیت مسترد کردی گئی۔

دارالمصنّفین اور بھوپال کے روابط میں مولانا سیّد سلیمان ندوی نے بھی علامہ شبلی کے شاگردِ رشید اور ناظم دارالمصنّفین کی حیثیت سے ایک اہم کڑی کا کام انجام دیا۔ ریاست کے آخری حکمراں نواب حمیداللہ خاں بھی سیّد صاحب کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے، چناں چہ اُن کے پیہم اصرار پر سیّد صاحب نے جون 1946 میں بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ احمدیہ کے امیر کا عہدہ سنبھالا، لیکن یہ سیاسی عدمِ استحکام کا زمانہ تھا، ملک کی آزادی کے بعد ریاست حکومتِ ہند میں ضم ہوگئی تو بادلِ ناخواستہ سیّد صاحب کو اکتوبر 1949 میں پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھنا پڑا، تاہم اُن کے قیامِ بھوپال کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ یہاں جامعہ احمدیہ کی قائم مقامی کے لیے دارالعلوم تاج المساجد کی بنیاد رکھی گئی اور اُس کے لیے تاج المساجد جیسی تشنۂ تکمیل لیکن عظیم مسجد کی تعمیر دوبارہ شروع ہوگئی۔

دارالمصنّفین سے بھوپال کے رشتے کو قائم و دائم رکھنے والی چھٹی شخصیت مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری (1913-1986) کی ہے، جو 1947 میں ادارے کے رکن منتخب ہوئے اور 'سیّد سلیمان ندوی صدی تقریبات' کے موقعے پر ستمبر 1985 میں 'بزمِ سلیمانی' کے عنوان سے ایک وقیع سمینار کا دارالعلوم تاج المساجد میں انعقاد کرکے اپنے استاد کے تئیں عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔ مقالات کا مجموعہ 'مطالعۂ سلیمانی' مرتبہ پروفیسر مسعود الرحمٰن ندوی شائع کیا، سیّد صاحب بھی انھیں بہت محبوب رکھتے تھے، دارالمصنّفین کی تعمیر و ترقی میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ 1965 کے جشن طلائی کے موقعے پر گیارہ ہزار کی رقم مولانا کی توجہ سے ادارے کو بھوپال سے ملی، مکاتیب مشاہیر دارالمصنّفین بنام مولانا محمد عمران خاں ندوی کے نام سے شائع کتاب سے بھی مولانا کے دارالمصنّفین سے گہرے رشتوں کا ثبوت ملتا ہے کیوں کہ اس میں مشاہیر کے مولانا کے نام دو سو خطوط موجود ہیں۔ دارالمصنّفین کے ناظم جناب صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی اِس میں شرکت کی اور کلیدی مقالہ پیش کیا۔

بھوپال سے دارالمصنّفین کے ایک اور رکن خاندان مجددیہ کے چشم و چراغ مولانا محمد سعید مجددی (پیدائش 1933، وفات 30 اپریل 2017) ہیں۔ اسی طرح پروفیسر خالد محمود کے لیے بھوپال وطن ثانی کی حیثیت رکھتا ہے، ان کی تعلیم بھوپال میں ہوئی اور وہ دارالمصنّفین کے رکن منتخب ہوئے۔

معروف ناقد محقق پروفیسر عبدالقوی دسنوی (1930-2011) کا بھی دارالمصنّفین سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

کیف بھوپالی کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی تھی

معصوم مرادآبادی

دُنیاے شعروشاعری میں برسوں اپنا جلوہ دکھانے والے البیلے شاعر کیف بھوپالی 20 فروری 1917 کو پیدا ہوئے مگر یہ بات کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کی پیدائش بھوپال میں نہیں بلکہ لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ان کے خاندان میں یہ رواج تھا کہ عورت زچگی کی حالت میں بھوپال سے لکھنؤ جایا کرتی تھی اوران کے خاندان کا ہر بچہ وہیں پیدا ہوا کرتا تھا تاکہ وہ پیدائشی تہذیب یافتہ ہو،مگر کیف بھوپالی کی پیدائش کے بعد خاندان کی اقتصادی حالت اچھی نہیں رہی اور کوئی اتنے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا، چناں چہ اس رواج کے تحت کیف بھوپالی لکھنؤ میں پیدا ہونے والے اپنے خاندان کے آخری فرد تھے۔یہ باتیں مجھے برسوں پہلے کیف بھوپالی نے ایک انٹرویو کے دوران بتائی تھیں۔اس انٹرویو کی تفصیلات بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔

یہ جون 1987 کی ایک گرم صبح تھی۔ مجھے کیف بھوپالی کا انٹرویو لینا تھا۔ طے شدہ وقت پر جب میں نے جن پتھ ہوٹل کی پہلی منزل پر پہنچ کران کے کمرے کی بیل بجائی تو خود کیف صاحب اپنے پاجامے میں ایزار بند ڈالتے ہوئے برآمد ہوئے۔وہ ابھی نہادھوکر تازہ دم ہوئے تھے اور میرے منتظر تھے۔مجھ سے بیٹھنے کو کہا اور وہیں رکھے ہوئے ایک بوسیدہ بریف کیس سے اپنا لمبا سا کرتا نکال کر پہن لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس بریف کیس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا اور انھوں نے اسے ایک دوسرے کمربند سے باندھ رکھا تھا۔ہوٹل کے کمرے میں ان کی چیزیں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں۔انھوں نے چائے کا آرڈر دیا اور ایک چھوٹی سی شیشی سے سرسوں کا تیل نکال کر اپنے سر پر ملنے لگے۔ بال بھی بہت کم تھے۔اسی تیل کے چند قطرے اپنے چہرے پر بھی لگائے اور وہ انٹرویو دینے کے لیے تیار ہوگئے۔ یہ ان کا آخری دور تھا۔ بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے اور چہرہ بھی اندر کو دھنسا ہوا تھا،لیکن وہ مشاعروں میں اسی جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ملاقات کی گذشتہ رات بھی پرگتی میدان میں عالمی اردو کانفرنس کے مشاعرے میں انھوں نے خوب رنگ جمایا تھا:

ہائے لوگوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں، رسوائیاں، بدنامیاں

کیف بھوپالی عجب قلندرانہ مزاج اور متضاد طبیعت کے مالک تھے۔انھوں نے غزلیں بھی لکھیں تو نفاست میں دھلی ہوئی، فلمی نغمے بھی لکھے تو 'پاکیزگی' میں دھلے ہوئے اور قرآن کا منظوم ترجمہ بھی کیا تو انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ مگر جام وسبو سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔

کیف بھوپالی
(1917-1991)

علامہ سیماب اکبرآبادی کے بعد شاید کیف بھوپالی ہی واحد شخصیت ہیں جنھیں خداوند قدوس نے قرآن کے منظوم ترجمے کی سعادت بخشی اور رند مشرب نے بہت ہی عقیدت کے ساتھ خدا کے کلام بلاغت نظام کو 'مفہوم القرآن' کے نام سے منظوم ترجمہ کا پیراہن عطا کیا۔

کیف بھوپالی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔انھوں نے غزل میں بھی روایت کی پاسداری کی۔انتہائی شائستہ لہجے میں شاعری کی اور غزل کو وقار اور شائستگی بخشی۔انھوں نے انسانی جذبات واحساسات کی نہایت سہل انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری عوامی ذہنوں پر دیرپا اثر چھوڑتی ہے اور دلوں کو مسحور کرلیتی ہے۔ وہ ایک خوش مزاج اور لبرل انسان تھے۔زبان پر بلا کی گرفت تھی۔ بہت خوب کہتے تھے اور اپنے مداحوں کے دلوں پر راج کرتے تھے۔انھیں عام لوگوں کے ساتھ رہنا پسند تھا۔ ان کی شخصیت اور بودوباش میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔مگر ان کی زندگی اتنی ہی بے ترتیب اور بے ہنگم تھی۔شاعروں کے ساتھ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔کیف بھوپالی مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے اور ہمہ وقت سفر میں رہتے تھے۔

یہ میری ان سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔اس سے پہلے انھیں بارہا لال قلعہ اور ڈی سی ایم کے مشاعروں میں سنا تھا۔ جب وہ مخصوص ترنم سے اپنا کلام سناتے تو ان کے چاہنے والے جھومنے لگتے تھے۔ ترنم میں سوز وساز دونوں کی آمیزش تھی۔لوگ انھیں بہت دل لگا کر سنتے تھے۔محرومیاں، مجبوریاں اور لاچاریاں ان کا مقدر تھیں۔ان کی مشہور غزل کا ایک شعر یوں ہے:

ہم ترستے ہی ترستے ہی ترستے ہی رہے
وہ فلانے سے فلانے سے فلانے سے ملے

ہر مشاعرے میں ان سے اس شعر کو سننے کی فرمائش ہوتی تھی۔ان کے مداح فرمائش کرتے تھے ''کیف صاحب، وہ تین فلانوں والا شعر سنادیجیے''۔وہ شعر ہی نہیں پوری غزل سنادیتے تھے:

خود سے مل جاتے تو چاہت کا بھرم رہ جاتا
کیا ملے آپ جواوروں کے ملانے سے ملے

سردیوں کے موسم میں جب ضلع بجنور کے مختلف علاقوں میں مشاعرے ہوتے تو کیف صاحب سیوہارہ کو اپنا مرکز بنالیا کرتے تھے۔ اسٹیشن روڈ پر ایک آرہ مشین تھی وہ اسی کے پاس اپنا کھٹولہ بچھا کر اپنے مداحوں سے ملتے رہتے تھے۔اس زمانے میں شاعروں کا ایک مثلث تھا جس میں کیف بھوپالی، شمیم جے پوری اور خمار بارہ بنکوی سب سے زیادہ مقبول تھے۔ یوں تو ترنم کی وجہ سے خمار بارہ بنکوی کی سب سے زیادہ ڈیمانڈ تھی، لیکن کیف صاحب بھی کم مقبول نہیں تھے۔ایک رات نور پور میں مشاعرہ تھا۔رات کے تین بجے مشاعرہ ختم ہوا تو لفافہ لے کر ٹھیکے پر پہنچ گئے، مگر وہ بند تھا۔انھوں نے ساقی کو آواز دی تو اس نے پوچھا کون؟ کیف صاحب کا نام سن کر وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا اور دکان کھول کر کیف صاحب کی فرمائش پوری کی۔

کیف بھوپالی کا فلمی دنیا سے بھی قریبی تعلق رہا۔کمال امروہی کی فلم 'پاکیزہ' میں ان کے گانے بہت مقبول ہوئے۔فلمی دنیا سے اپنی وابستگی کی داستان بیان کرتے ہوئے کیف صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ''اداکارہ زینت امان کے والد امان اللہ خاں بھی شاعر تھے، شمیم ان کا تخلص تھا۔بھوپال کی رائل فیملی سے ان کا تعلق تھا، وہ میرے بچپن کے دوست تھے۔انھوں نے مجھے بمبئی بلالیا اور کمال امروہی سے میری ملاقات کرائی۔ یہ 1949 کی بات ہے جب کمال امروہی اپنی فلم 'محل' بنارہے تھے۔ پہلی مرتبہ میں نے کمال امروہی کی فلم 'دائرہ' کے لیے نغمے لکھے۔مگر اصل دھوم فلم 'پاکیزہ' کے نغموں نے مچائی۔'پاکیزہ' کی ریلیز کے بعد میری بہت آؤ بھگت ہونے لگی، ورنہ مجھے کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ میری تمام صلاحیتوں، قابلیتوں کے باوجود مجھے کبھی نہیں پوچھا گیا''۔کیف بھوپالی کا یہ دلچسپ انٹرویو خاکسار کی کتاب 'بالمشافہ' میں شامل ہے۔

Z-103، تاج انکلیو، دہلی-110031
E-mail: masoom.moradabadi@gmail.com

کیف بھوپالی عجب قلندرانہ مزاج اور متضاد طبیعت کے مالک تھے۔انھوں نے غزلیں بھی لکھیں تو نفاست میں دھلی ہوئی، فلمی نغمے بھی لکھے تو 'پاکیزگی' میں دھلے ہوئے اور قرآن کا منظوم ترجمہ بھی کیا تو انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ مگر جام وسبو سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے بعد شاید کیف بھوپالی ہی واحد شخصیت ہیں جنھیں خداوند قدوس نے قرآن کے منظوم ترجمے کی سعادت بخشی اور رند مشرب نے بہت ہی عقیدت کے ساتھ خدا کے کلام بلاغت نظام کو 'مفہوم القرآن' کے نام سے منظوم ترجمہ کا پیراہن عطاکیا۔

اردو دُنیا

اقلیتی تعلیم کے فروغ کے لیے ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کی عمارت کا افتتاح

کرنول (30 جنوری)۔ ریاستی وزیرِ صنعت، تجارت اور فوڈ پروسیسنگ ٹی. جی. بھرت نے ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کی انتظامی عمارت کی تعمیر کا افتتاح کیا۔ اس عمارت کی تعمیر کے لیے وزیرِ موصوف نے اپنی جانب سے ایک کروڑ روپے عطیہ دیا ہے۔ اس موقعے پر پانیام کی ایم ایل اے محترمہ گورو چرتھا، یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پی. شاہ ولی خاں، رجسٹرار پی. لوک ناتھ، عثمانیہ کالج گروپ آف ایجوکیشن انسٹی ٹیوشنس کی کورسپانڈنٹ عذرا جاوید، عثمانیہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سیّد سمیع الدین مزمل، منصور علی خاں، نوشاد، سیّد عباس، عبدالحمید، ایڈووکیٹ جہانگیر اور کئی اقلیتی قائدین موجود تھے۔ وزیر ٹی. جی. بھرت نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پچھلی وائی ایس آر سی پی حکومت نے اردو یونیورسٹی کو نظر انداز کیا۔ انھوں نے کہا کہ سابقہ ٹی ڈی پی حکومت نے 2016 میں اردو یونیورسٹی کو 18.5 کروڑ روپے کے بجٹ اور 144 ایکڑ زمین کے ساتھ قائم کیا تھا اور انتظامی عمارت کے لیے دو کروڑ روپے بھی منظور کیے گئے تھے، لیکن حکومت کی تبدیلی کے بعد یہ ترقیاتی کام رک گئے۔ وزیر نے کہا کہ 2023 میں ہم نے اردو یونیورسٹی کے مسئلے پر آواز اٹھائی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ حکومت بننے پر اس ادارے کو ترقی دی جائے گی۔ اب ہماری حکومت بن چکی ہے، اسی لیے فنڈز کی کمی سے رکی ہوئی عمارت کی تعمیر مکمل کرنے کے لیے میں نے ذاتی طور پر ایک کروڑ روپے عطیہ دیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اب یونیورسٹی کے لیے بجٹ کی ضرورت 18.5 کروڑ سے بڑھ کر تقریباً 31 کروڑ روپے ہو چکی ہے۔ مستقبل میں یونیورسٹی میں ٹیکنیکل اور جدید مضامین بھی متعارف کرائے جائیں گے۔ وزیر ٹی. جی. بھرت نے یقین دلایا کہ موجودہ حکومت اقلیتوں کو تعلیم سمیت ہر شعبے میں آگے بڑھانے کے لیے پوری طرح سنجیدہ ہے۔ (رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام تعلیمی وثقافتی مقابلوں میں کامیاب طلبہ کو اعزاز

نئی دہلی (25 فروری)۔ اُردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام سال 2025 کے تعلیمی وثقافتی مقابلوں میں کامیاب طلبہ کے اعزاز میں 24 فروری 2026 کو ایوانِ غالب، ماتا سندری لین، نئی دہلی میں جلسۂ تقسیمِ انعامات منعقد ہوا۔ تقریب میں دہلی کے مختلف اسکولوں کے طلبہ و طالبات، اساتذہ اور والدین نے شرکت کی۔ یہ تعلیمی مقابلے 20 اگست تا 8 ستمبر 2025 اردو اسکولوں کے طلبہ و طالبات کے درمیان منعقد کیے گئے تھے، جن میں تحریری امتحانات، مضمون نویسی، تقریری کوئز، غزل سرائی، اردو ڈراما، بیت بازی، گروپ سانگ، بلند خوانی اور اُمنگ پینٹنگ جیسے متنوع مقابلے شامل تھے۔ تقریباً 1663 طلبہ و طالبات نے ان مقابلوں میں حصہ لیا تھا، جن میں سے 265 طلبہ مختلف زمروں میں کامیاب قرار پائے گئے تھے۔ اس موقعے پر محکمۂ فن، ثقافت والسنہ، حکومتِ دہلی کے ایڈیشنل سکریٹری اور اردو اکادمی، دہلی کے سکریٹری جناب لیکھ راج نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو نہ صرف ایک دلنشیں زبان ہے بلکہ باوقار تہذیب کی نمائندہ بھی ہے۔ انھوں نے تعلیمی وثقافتی مقابلوں میں طلبہ کی بڑی تعداد میں شرکت کو نئی نسل میں اردو کے بڑھتے شوق کا ثبوت قرار دیا۔ انھوں نے انعام یافتہ طلبہ و طالبات کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ وہ مستقبل میں بھی محنت اور لگن کے ساتھ تعلیمی وادبی میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کریں گے۔ انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ آئندہ مقابلوں کے زمروں میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو اپنے فن کے اظہار کا موقع مل سکے۔ جلسۂ تقسیمِ انعامات میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ میں نقد انعامات، اسناد اور مومنٹو تقسیم کیے گئے۔ اس سال بہترین شرکت کا ایوارڈ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل اسکول، جعفرآباد کو دیا گیا، جب کہ بہترین کارکردگی کا ایوارڈ سیّد عابد حسین جامعہ اسکول نے حاصل کیا۔ دونوں اسکولوں کو 21-21 ہزار روپے نقد انعام، مومنٹو اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ اس طرح اسناد، مومنٹو اور شیلڈز کے ساتھ نقد انعامات کی مجموعی رقم تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ روپے تقسیم کی گئی۔ پروگرام کی نظامت محترمہ ریشما فاروقی نے کی۔ اختتام پر کامیاب طلبہ کو مبارک باد پیش کی گئی اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ اکادمی آئندہ بھی علمی وادبی سرگرمیوں کے ذریعے نئی نسل کی صلاحیتوں کو فروغ دیتی رہے گی۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے مطالبات، این سی پی یو ایل سے فوری اقدام کی اپیل

مالیاتی کمیٹی تشکیل دی جائے اور طویل عرصے سے زیرِ التوا تجاویز کو جلد از جلد منظوری دی جائے

نئی دہلی (22 فروری)۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے صدر ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (NCPUL) کی کارکردگی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اردو کے فروغ سے متعلق اہم منصوبے طویل عرصے سے تعطل کا شکار ہیں، جس کے باعث ادبی وتعلیمی حلقوں میں بے چینی پائی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پی ایم او دفتر سے جواب موصول ہونے کے بعد یہ امر نہایت تشویشناک ہے کہ دو سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک این سی پی یو ایل کی کوئی باقاعدہ میٹنگ منعقد نہیں کی گئی۔ صدر اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے اس صورتِ حال پر شدید افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ کونسل کو فوری طور پر فعال بنایا جائے اور زیرِ التوا امور کی انجام دہی کے لیے ہنگامی اقدام کیے جائیں۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے مزید کہا کہ اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے بنائی گئی اسکیمیں، مالی امداد، اشاعتی منصوبے اور تربیتی پروگرام اُسی وقت موثر ہو سکتے ہیں جب ادارہ عملی طور پر سرگرم ہو۔ انھوں نے حکومت اور متعلقہ وزارت سے اپیل کی کہ فوری مداخلت کرتے ہوئے میٹنگوں کا انعقاد یقینی بنایا جائے، مالیاتی کمیٹی تشکیل دی جائے اور طویل عرصے سے زیرِ التوا تجاویز کو جلد از جلد منظوری دی جائے تاکہ ملک میں اردو کے فروغ کا عمل موثر انداز میں آگے بڑھ سکے۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

'پریم چند کا ادب: ماضی، حال اور مستقبل' پر سمینار

میرٹھ (29 جنوری)۔ باری تعالیٰ نے انسان کو سب سے افضل بنایا ہے۔ انسان کی اہم ایجادات میں سے ایک بولنا اور دوسرا لکھنا بہت اہم ہے۔ پریم چند اردو کے ہیں یا ہندی کے، پریم چند نے اردو میں پہلے لکھنا شروع کیا اور پھر انھی کہانیوں کو انھوں نے ہندی میں شائع کرایا اور اس کے پیچھے کی وجہ بھی انھوں نے اپنے ایک خط میں جو 'نیرنگِ خیال' میں شائع ہوا تھا، اس میں تحریر ہے کہ اردو میں میری کتابیں کوئی خاص ارننگ نہیں کرتی تھیں، اسی لیے میں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ الفاظ تھے معروف اسکالر پروفیسر تنویر چشتی کے جو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو کے پریم چند سمینار ہال میں منعقد دو روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان 'پریم چند کا ادب: ماضی، حال اور مستقبل' کے دوسرے دن کے اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میری آپ سب حضرات سے گزارش ہے کہ آپ میگزین اور کتابیں خرید کر پڑھنا شروع کریں جو کوئی آپ کو تحفے میں کتابیں پیش کرے اس کو کچھ رقم ضرور دیں تاکہ ہمارے بیچ کتابیں زندہ رہیں۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز سعید احمد سہارنپوری نے تلاوتِ کلام پاک سے کیا، بعد ازاں مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ دوسرے دن دوسرے اور تیسرے سیشن کی محفلِ صدارت میں پروفیسر تنویر چشتی (اتراکھنڈ)، پروفیسر جمال احمد صدیقی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر کویتا تیاگی (میرٹھ)، امیر مہدی (انگلینڈ)، بدر عالم، ڈاکٹر آصف علی رونق افروز رہے۔ جب کہ مقالہ نگار کے طور پر ڈاکٹر وصی اعظم انصاری (لکھنؤ) نے 'پریم چند کا ادب اور دلت مسائل'، ڈاکٹر محمد مستمر (دہلی) نے 'پریم چند: ماضی، حال اور مستقبل'، ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم (الٰہ آباد) نے 'پریم چند کے کردار ہوری اور دھنیا'، ڈاکٹر الکا وششٹھ (میرٹھ) نے 'پریم چند کا ادب: ماضی، حال اور مستقبل'، امرین ناز نے 'پریم چند کے افسانوں میں حب الوطنی' اور ارشاد سیانوی نے 'ترقی پسندی اور پریم چند' کے عناوین پر اپنے پُرمغز مقالات پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم انیس میرٹھی نے ادا کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وصی اعظم انصاری، ڈاکٹر محمد مستمر، بدر محمود، ڈاکٹر یشیکا ساگر، پروفیسر جمال احمد صدیقی اور ڈاکٹر کویتا تیاگی نے مقالات پیش کیے۔

صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو اور معروف ادیب وفکشن ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اس سمینار میں جتنے بھی مقالے پڑھے گئے وہ بہت ہی عمدہ تھے۔ مقالوں کا مواد اور ان کی پیش کش بھی بڑی شاندار تھی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر یشیکا ساگر، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر فرخ ناز، آفاق احمد خاں، انیس میرٹھی، سیّدہ مریم الٰہی، محمد عیسیٰ رانا، محمد زبیر، محمد ندیم، عظمیٰ سحر، کشش خاں، سرتاج جہاں، نزہت اختر، عمائدینِ شہر اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔ آخر میں ڈاکٹر آصف علی نے تمام مقالہ نگاروں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ڈاکٹر محبوب حسن ایلومنی ایسوسی ایشن کے صدر منتخب

وارنسی (25 فروری)۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایلومنی ایسوسی ایشن کی تشکیل باضابطہ طور پر عمل میں آئی۔ ڈاکٹر ناظر حسین خاں کے کوآرڈینیشن میں ایسوسی ایشن کے ممبران اور اراکین کے باہمی اتفاقِ رائے سے عہدے داران کا انتخاب کیا گیا۔ ڈاکٹر محبوب حسن کو ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ تنظیم کے دوسرے عہدے داران میں ڈاکٹر پرویز عالم خاں (نائب صدر)، ڈاکٹر سراج احمد انصاری (سکریٹری)، ڈاکٹر اظہر سعید (نائب سکریٹری)، ڈاکٹر منی بھوشن (خازن) اور ڈاکٹر شمشیر (نائب خازن) منتخب ہوئے۔ واضح رہے کہ ایسوسی ایشن کی مدتِ کار دو برس پر مشتمل ہوگی۔ شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی کی ایک شاندار علمی وادبی روایت رہی ہے۔ شعبۂ اردو کے موجودہ صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کی سرپرستی میں شعبۂ اردو نہایت فعال اور سرگرم ہے۔ شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کا قیام 1916 میں عمل میں آیا۔ کم وبیش ایک صدی گزرنے کے بعد بھی شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی میں المنائی ایسوسی ایشن کی تشکیل عمل میں نہ آسکی تھی اور نہ شعبے کے پاس ابنائے قدیم کا کوئی ڈیٹا موجود تھا۔ صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز ہوتے ہی پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے شعبۂ اردو کے حق میں کئی اہم پیش رفت کی۔ المنائی ایسوسی ایشن کی تشکیل بھی موصوف کی دوراندیشی اور مثبت فکر کا نتیجہ ہے۔ المنائی ایسوسی ایشن کی تشکیل کا بنیادی مقصد اردو زبان وادب کا فروغ ہے۔ اب تک کم وبیش 500 کی تعداد میں شعبے کے فارغین ایسوسی ایشن میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس کے زیرِ اہتمام مختلف اقسام کی علمی اور ادبی تقریبات منعقد ہو چکی ہیں۔

شعبۂ اُردو، اے ایم یو میں

ریسرچ ایسوسی ایشن کے تحت جلسے کا انعقاد

علی گڑھ (24 فروری)۔ تحقیق کو فروغ دینے اور طلبہ و طالبات میں ریسرچ سے لگاؤ پیدا کرنے میں ریسرچ ایسوسی ایشن کا اہم کردار ہے، اس ایسوسی ایشن کا قیام ہی اس لیے عمل میں آیا تھا تا کہ طلبہ و طالبات کو ایک پلیٹ فارم مل سکے۔ یہ باتیں صدر شعبۂ اردو، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے کہیں۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رشید احمد صدیقی ہال میں ریسرچ ایسوسی ایشن کے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ طلبہ و طالبات کو اس پلیٹ فارم سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یہاں آپ کو بھی اساتذہ کی رہنمائی حاصل ہے، آپ ایک پیپر لکھتے ہیں جب اسے اپنے اساتذہ کی موجودگی میں اپنے ساتھیوں کو سناتے ہیں تو اس سے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے ریسرچ ایسوسی ایشن کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آپ کی تحقیقی صلاحیتوں کا فروغ ہی اس ایسوسی ایشن اور اس کے جلسوں کا اہم اور بنیادی مقصد ہے۔ اس سے قبل ریسرچ اسکالر توحید خاں کی تلاوتِ کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا، جب کہ ایسوسی ایشن کے سکریٹری اور ناظمِ جلسہ عبدالوحید نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایسوسی ایشن کے بارے میں گفتگو کی۔ اس پروگرام میں ریسرچ اسکالر صدام حسین مضمر نے اپنا مقالہ مناظر فطرت اور ان سے متعلق لفظیات میں راشد انور راشد کا فکری شعور، طاہر حسین نے نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں اردو زبان و ادب کی ترقی کے امکانات ایک جائزہ، جب کہ رئیس عالم نے مخمور سعیدی کی غزلیہ شاعری (ماضی کے حوالے سے) سے پیش کیا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر سیّد سراج الدین اجملی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ریسرچ ایسوسی ایشن کے جلسے دراصل تربیتی ورکشاپ ہیں، یہاں اگر آپ اپنے تحقیقی مضامین پیش کرتے ہیں تو اس سے آپ کی تحقیق کو جِلا ملے گی، اسی طرح اسٹیج پر مقالہ پڑھنے کی بھی ٹریننگ ہوگی۔ انھوں نے طلبہ و طالبات کو مشورہ دیا کہ انھیں اسٹیج سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر معید الرحمٰن نے مقالہ پیش کرنے والے ریسرچ اسکالرس کو مبارک باد پیش کی اور انھیں مفید مشوروں سے نوازا۔ انھوں نے کہا کہ کتابوں میں جو باتیں درج ہیں ان کو نقل کر دینا ہی مقالہ نہیں ہے بلکہ یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا نقطۂ نظر بھی بیان کریں اور بتائیں کہ متعدد مآخذ تک رسائی اور مطالعے کے بعد آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تنقید ہو یا تحقیق دونوں میں نتائج بہت اہم ہوتے ہیں ورنہ سب کچھ کتابوں میں درج ہے۔ ڈاکٹر معید الرحمٰن نے ہر مقالے کی کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے تحقیقی و تنقیدی میدان میں طلبہ کی رہنمائی کی، خاص طور پر انھوں نے راشد انور راشد کی شاعری کی لفظیات کی تشکیل، مطالعۂ فطرت میں ان کی جدت و جودت، مخمور سعیدی کی شاعری میں ماضی اور این ای پی میں مادری زبان اور ترجمے کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے نیشنل ایجوکیشن پالیسی 2020 پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ نیشنل ایجوکیشن پالیسی حکومت کی ایک اہم پالیسی ہے جس میں مادری زبان کو اہمیت دی گئی ہے تا کہ بچہ بہتر طریقے پر اپنی مادری زبان سیکھ سکے۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

رفتید ولے نہ از دلِ ما

جیلانی بانو

نئی دہلی۔ اردو ادب کے افق پر افسانہ نگاری کا ایک روشن و معتبر نام، ممتاز افسانہ نگار و صاحبِ طرز ادیبہ پدم شری جیلانی بانو یکم مارچ 2026 کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔ وہ کافی عرصے سے علیل تھیں۔ حیدرآباد میں انھوں نے آخری سانس لی۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا ایک توانا، حساس و باشعور ادیبہ سے محروم ہوگئی ہے۔ انھوں نے اپنے گہرے مشاہدے، حقیقت پسندانہ اسلوب و سماجی شعور سے بھرپور تحریروں کے ذریعے اردو افسانے کو نئی فکری جہت سے روشناس کرایا۔

جیلانی بانو کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع بدایوں میں 14 جولائی 1936 کو ہوئی۔ انھوں نے جس عہد میں ہوش سنبھالا، وہ جاگیردارانہ ماحول و معاشرے کی ٹوٹتی بکھرتی روایتوں اور قدروں، سیاسی و سماجی تغیرات اور تحریکِ آزادی کا دور تھا۔ اس دور کے حالات و مسائل نے ان کے حساس ذہن کو متاثر کیا۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور دیگر سیاسی، سماجی مسائل کو کہانیوں کے پیرایے میں ڈھال دیا۔

ابتدائی عمر ہی سے انھوں نے میر تقی میر، غالب، اقبال، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، گورکی، چیخوف، موپساں، بیدی، فیض احمد فیض، مجاز، قرۃ العین حیدر اور احمد ندیم قاسمی سمیت تمام بڑے ادبا کی تحریریں پڑھ ڈالی تھیں۔ ان عظیم مصنفین کی تخلیقات کے مطالعے نے ان کی صلاحیتوں کو خوب جِلا بخشی۔ جیلانی بانو نے نثر کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ انھوں نے اپنا تخلیقی سفر ملک کی آزادی کے بعد شروع کیا۔ ان کی شہرۂ آفاق تحریر 'موم کی مریم' ماہنامہ 'سویرا' میں شائع ہوئی جس نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

جیلانی بانو نے 2002 میں ایک افسانہ لکھا جس کا عنوان ہے 'عباس نے کہا'، جسے صلاح الدین پرویز نے اپنے ادبی جریدے 'استعارہ' میں شائع کیا۔ یہ افسانہ عراق پر ہونے والی جنگ میں امریکی مظالم کی کہانی پر مبنی ہے۔ اردو کے نسائی ادب میں وہ فکشن کے حوالے سے وہ بلند مقام پر نظر آتی ہیں اور یہ مقام انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے زور پر حاصل کیا۔ جیلانی بانو نے اپنے ناولوں میں کچھ ایسے مسائل کو موضوع بنایا ہے جو برسہا برس گزرنے کے بعد بھی اس جدید ترین معاشرے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جیلانی بانو کے ناولٹ کا مجموعہ 'جگنو اور ستارے' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا تھا۔ انھیں متعدد ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا جن میں غالب ایوارڈ، دوشیزہ ایوارڈ (پاکستان)، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ (ماسکو)، مہاراشٹر اردو اکیڈمی ایوارڈ، نقوش ایوارڈ (پاکستان)، پدم شری ایوارڈ (ہندستان) اور اردو اکادمی، دہلی کا کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ شامل ہیں۔ ان کی معروف تحریروں میں روشنی کے مینار، جگنو اور ستارے، نغمے کا سفر، ایوانِ غزل، بارشِ سنگ، رستہ بند ہے، پرایا گھر، بات پھول کی، یقین کے آگے گمان کے پیچھے، سچ کے سوا وغیرہ شامل ہیں۔

احمد رشید شیروانی

نئی دہلی۔ معروف ماہرِ تعلیم اور بھارت سیوا ٹرسٹ کے مینجنگ ٹرسٹی احمد رشید شیروانی کا 23 فروری 2026 کو حیدرآباد میں انتقال ہوگیا، ان کی عمر 93 برس تھی۔ یہ اطلاع بھارت سیوا ٹرسٹ کے سکریٹری انوار اللہ نے دی۔ پندرہ برس قبل مرحوم ڈی ایل ایف قطب انکلیو، گروگرام سے حیدرآباد شفٹ ہوگئے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ نصرت شیروانی، ایک بیٹا تصدق شیروانی، دو بیٹیاں آمنہ اور آسیہ شیروانی ہیں۔ شیروانی صاحب جوانی کے دنوں سے ہی مسلم بچوں کی تعلیم کے حوالے سے آخر دم تک فکرمند رہے۔ اس کے لیے اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال وغیرہ سے مسلم اسکولوں اور کالجوں سے دسویں اور بارہویں کلاسوں کے رزلٹ منگواتے، ان کا سال بہ سال تجزیہ کرتے اور پرنسپلوں کو خطوط کے ذریعے بتاتے کہ رزلٹ میں کہاں کہاں بہتری ہوئی اور کہاں اس کی گنجائش ہے۔ ٹرسٹ کی جانب سے ہونہار طلبہ و طالبات کو انعام اور محنتی ٹیچرز کو ایوارڈ بھی بھیجے جاتے تھے۔ دہلی میں قیام کے دوران شیروانی صاحب مشاورت (سیّد شہاب الدین) کے ٹرسٹ رار بھی رہے تھے۔ احمد رشید شیروانی کے انتقال پر تعزیت کرتے ہوئے پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ وہ بہت بڑے اور قوم کے تئیں دردمندی رکھنے والے لیڈر تھے۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی، ان کی شخصیت پر علی گڑھ کی تہذیب و ثقافت نمایاں طور پر حاوی۔ ان کے انتقال سے علم دوست حلقوں میں رنج و غم کا ماحول ہے۔

جیتندر بِلّو

ممبئی۔ اردو کے مشہور فکشن نگار جتندر بلّو کا 89 سال کی عمر لندن میں انتقال کر گئے۔ اردو کے استاد الیاس شوقی نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ جتندر بلّو دیولا مبا المعروف بہ جتیندر بلّو 18 نومبر 1937 کو پیشاور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا، وہ 1975 تک ممبئی میں رہے، 1976 میں جتیندر بلّو انگلینڈ ہجرت کر گئے، جہاں 9 فروری 2026 کو انھوں نے آخری سانسیں لیں۔ سینئر شاعر اور مترجم یعقوب راہی نے جتیندر بلّو کی قلمی نگارشات پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے کئی ناولوں اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے چند نام اس طرح ہیں: پرائی دھرتی، اپنے لوگ، مہانگر، جزیرہ، وشواس گھات، پہچان کی نوک پر، انجانا کھیل، اپنے دیس میں، چکّر، درد کی حد سے پرے اور آخری پڑاؤ۔ ان کا سوانحی کولاژ دو حصوں میں 'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی' اور 'میں اور میری شخصیت' نامی کتاب بھی منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ ممبئی کے 'نیا ورق' جیسے ممتاز رسالے میں ان کی تخلیقات تواتر سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہ لاولد تھے، ان کے پس ماندان میں صرف بیوہ ہیں۔

اُدھو مہاجن بسمل

پونے۔ شہر پورنے کے مشہور و معروف اردو، ہندی اور مراٹھی شاعر، ادیب، صحافی اور سولہ کتابوں کے مصنف ادھو مہاجن بسمل اتوار 25 جنوری 2026 کی رات 9:30 بجے کم و بیش ایک ماہ کی علالت کے بعد اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ ان کا انتم سنسکار 27 جنوری کو منڈوا شمشان بھومی، پونے میں صبح دس بجے ہوا۔ مراٹھی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اُدھو مہاجن بسمل نے اپنے 'گروجی' نذیر فتحپوری سے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ انھیں رحمۃ للعالمین حضرت محمدؐ سے بے پناہ عقیدت تھی جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ نعتیہ کلام ہے جس میں جذبہ اور عقیدت کے ساتھ ساتھ سیرتِ نبویؐ سے اُن کی وابستگی جھلکتی ہے۔ ان کے استاد ڈاکٹر نذیر فتحپوری کے بقول اُنھوں نے ضد کر کے اردو سیکھی اور شعر کہنے پر قدرت حاصل کی تھی۔ اُدھو مہاجن ایتھل گارڈن ڈی ایڈ کالج میں ہندی ڈپارٹمنٹ کے سربراہ تھے۔ ان کی کتابوں کے نام اس طرح ہیں: محمد سب کے لیے، حرفِ غزل، عکسِ غزل، نئے خواب غزل کے، غزل کے ساتھ، دشتِ امکاں سے پرے۔ جو کتابیں دیوناگری میں شائع ہوئیں اُن کے نام ہیں: تھوڑا سا آسمان، دھوپ میں سایہ، غزل کے ساتھ، نئے خواب غزل کے اور مٹی کی خوشبو۔ اُدھو مہاجن کے انتقال سے پونے اور مہاراشٹر کی مشترکہ لسانی تہذیب ہی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ ایک مشفق، نیک اور نرم خو انسان رخصت ہوگیا۔ اُن کے پس ماندگان میں بیوی، دو بیٹے، بہو، پوتے، پوتی وغیرہ شامل ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

مزاحمت کا فریب: افتخار عارف کے شعر کا نظریاتی محاکمہ

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

افتخار عارف کے اس مبہم، خطیبانہ اور محفوظ شعر کے مقابلے میں اگر ہم احمد فراز کو رکھ کر دیکھیں تو فرق محض اسلوب یا لہجے کا نہیں رہتا، بلکہ یہ فرق شاعری اور تاریخ کے باہمی رشتے کا بن جاتا ہے۔ فراز کی شاعری میں آمریت اور جبر کسی تجریدی استعارے کی شکل میں نہیں آتے بلکہ ایک زندہ، پہچانے جانے والے اور نامعلوم نہ رہنے والے دشمن کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فراز کے ہاں شاعری پڑھتے ہوئے قاری کو کبھی یہ سوال درپیش نہیں ہوتا کہ شاعر کس سے مخاطب ہے یا کس قوت کو چیلنج کر رہا ہے۔

فراز کی نظم 'محاصرہ' اس حوالے سے محض ایک ادبی متن نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظم کسی خیالی جبر یا کسی فرضی خدانما لہجے کے خلاف نہیں لکھی گئی، بلکہ ایک ایسے عہد کے خلاف لکھی گئی جس میں ریاست، قانون، زبان حتیٰ کہ سانس تک محاصرے میں آ چکے تھے۔ محاصرہ میں فراز کسی ایک شعر کے زور پر مزاحمت کا تاثر نہیں دیتے، بلکہ پوری نظم ایک مسلسل گھٹن، نگرانی اور خوف کی فضا قائم کرتی ہے۔ یہاں محاصرہ صرف شہر کا نہیں، ذہن کا ہے؛ صرف سڑکوں کا نہیں، لفظوں کا ہے؛ اور صرف جسم کا نہیں، ضمیر کا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں فراز اور افتخار عارف کے درمیان حدِ فاصل نمایاں ہو جاتی ہے۔ افتخار عارف کا شعر وقت کو ایک اخلاقی منصف بنا کر خود کو بری الذمہ کر لیتا ہے، جبکہ فراز وقت کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر فردِ جرم عائد کرتے ہیں۔ فراز کے ہاں شاعر یہ نہیں کہتا کہ 'وقت سب کچھ ٹھیک کر دے گا' بلکہ یہ احساس موجود رہتا ہے کہ اگر آج آواز نہ اٹھائی گئی تو وقت خود مجرم بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فراز کی شاعری ریاست کے لیے قابلِ قبول نہیں رہی اور یہی وجہ ہے کہ انھیں جیل، نگرانی اور جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ فراز کی غزلوں میں بھی یہ وضاحت برقرار رہتی ہے۔

افتخار عارف کے ہاں شہر، وقت، خدا اور لہجہ سب علامتیں ہیں، مگر ایسی علامتیں جو کسی ایک حقیقت سے بندھی نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعر ہر دور میں 'درست' لگ سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایک دور میں 'خطرناک' ثابت نہیں ہوتا۔ فراز کی شاعری اپنے عہد سے جڑنے کے بعد ہر عہد سے جڑی ہوئی ہے۔

یہ فرق اس وقت اور گہرا ہو جاتا ہے جب ہم شاعر کے عمل اور اس کے متن کو ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں۔ فراز نے جو کچھ لکھا، اس کی قیمت ادا کی۔ ان کی شاعری ان کے جسم، ان کی آزادی اور ان کی زندگی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ افتخار عارف کے ہاں یہ ربط ناپید ہے۔ ان کے اشعار بلند آہنگ ضرور ہیں، مگر ان کے پیچھے کوئی ایسی زندگی نہیں کھڑی جو ان اشعار کی گواہی دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعر 'خدا کے لہجے' پر سوال اٹھاتا دکھائی دیتا ہے، مگر شاعر خود ہر زمینی خدا کے ساتھ باوقار طریقے سے چلتا نظر آتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ مسئلہ نوکری کرنے یا کسی ادارے میں کام کرنے کا نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ شاعر نے اپنی شاعری کو کبھی اس ادارہ جاتی طاقت کے خلاف استعمال نہیں کیا جس سے وہ خود مستفید ہوتا رہا۔ فراز کے ہاں یہ تضاد نہیں ملتا۔ ان کی شاعری اور ان کی زندگی ایک دوسرے کی توثیق کرتی ہیں۔ افتخار عارف کے ہاں شاعری اور زندگی ایک دوسرے کی نفی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعر بظاہر جتنا سخت لگتا ہے، اتنا ہی اندر سے کھوکھلا محسوس ہوتا ہے۔

محاصرے میں فراز جس طرح گھٹن کو ایک اجتماعی تجربہ بناتے ہیں، وہ کسی ایک شعر کی چابک دستی نہیں بلکہ مسلسل فکری دباؤ کا نتیجہ ہے۔ قاری نظم ختم کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا کہ 'کیا خوب کہا' بلکہ یہ کہتا ہے کہ 'یہ سب ہم پر گزر رہی ہے'۔ افتخار عارف کے شعر کے ساتھ یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہاں داد ملتی ہے، سر ہلتے ہیں اور محفل آگے بڑھ جاتی ہے۔ کوئی سوال باقی نہیں رہتا، کوئی سمت متعین نہیں ہوتی۔ اسی لیے فراز کی شاعری آج بھی ریاست اور طاقت کے لیے غیر آرام دہ ہے، جب کہ افتخار عارف کی شاعری ریاستی تقریبات میں بھی اسی اطمینان سے پڑھی جا سکتی ہے جس اطمینان سے کسی نیم اخلاقی خطبے کو سنا جاتا ہے۔ یہ فرق محض شاعری کا نہیں، یہ فرق شاعر کے کردار کا ہے۔

احمد فراز کی شاعری اپنی وضاحت، قیمت اور خطرے کی وجہ سے ایک حقیقی مزاحمتی متن بنتی ہے، جب کہ افتخار عارف کی شاعری اپنی مبہم علامتوں، محفوظ لہجے اور ادارہ جاتی موافقت کی وجہ سے محض ایک ڈرامائی تاثر تک محدود رہتی ہے۔ فراز کا محاصرہ ہمارا بھی محاصرہ کر لیتا ہے مگر افتخار عارف کے الفاظ ہمیں صرف چھو کر گزر جاتے ہیں۔

جلیل عالی اسی عہد کے شاعر ہیں، مگر افتخار عارف کے برعکس ان کے ہاں یہ ابہام نہیں کہ وہ کس فکری روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ جلیل عالی اقبال کے ماننے والوں میں شمار ہوتے ہیں اور یہ وابستگی محض دعوا نہیں بلکہ ان کی شاعری کے فکری سانچے میں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے یہاں خودی، قومی شعور، اجتماعی زوال اور تہذیبی شکست کا احساس بار بار ابھرتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ جلیل عالی کے پاس نظریہ نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس نظریے کو پورے حوصلے کے ساتھ جینے سے گھبراتے ہیں۔ یہی خوف، یہی ہچکچاہٹ اور یہی پسپائی ان کی شاعری کی بنیادی نفسیاتی کیفیت بن جاتی ہے۔

جلیل عالی کی شاعری میں بزدلی کو اگر بے رحمی سے پرکھا جائے تو وہ ایک اخلاقی کمزوری ضرور ہے، مگر یہ کمزوری افتخار عارف کی طرح مفاہمت یا موقع پرستی کی شکل اختیار نہیں کرتی۔ جلیل عالی کے ہاں خوف ہے، مگر وہ خوف کسی نہ کسی سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ اشاروں کنایوں میں بات کرتے ہیں، براہِ راست ٹکراؤ سے بچتے ہیں، مگر ان کی شاعری یہ ضرور بتا دیتی ہے کہ وہ کس طرف کھڑے ہونا چاہتے تھے، مگر کھڑے نہ ہو سکے۔ یہ ناکامی ایک اخلاقی ناکامی ہے، مگر اس ناکامی کے باوجود ان کے ہاں سمت موجود رہتی ہے۔ افتخار عارف کے ہاں یہ سمت ہی مفقود ہے؛ وہاں نہ خوف ہے، نہ پسپائی، کیوں کہ وہاں سرے سے کوئی خطرہ مول ہی نہیں لیا گیا۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں جلیل عالی اور افتخار عارف کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچی جا سکتی ہے۔ جلیل عالی کے ہاں شاعر اور نظریہ کے درمیان ایک کشمکش جاری رہتی ہے؛ وہ اپنے نظریے سے پیچھے ہٹتے ہوئے بھی اس کا انکار نہیں کرتے۔ افتخار عارف کے ہاں ایسی کوئی کشمکش نظر نہیں آتی، کیوں کہ انھوں نے کبھی خود کو اس مقام پر رکھا ہی نہیں جہاں کشمکش جنم لے۔ جلیل عالی کی شاعری میں خوف ایک زندہ عنصر ہے اور خوف ہمیشہ کسی خطرے کی موجودگی کی علامت ہوتا ہے۔ افتخار عارف کی شاعری میں خوف کا نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہاں خطرہ کبھی موجود ہی نہیں تھا۔ یہی فرق جلیل عالی کو تمام تر کمزوریوں اور اخلاقی سمجھوتوں کے باوجود، افتخار عارف سے فکری طور پر ایک درجہ اوپر رکھتا ہے

کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ افتخار عارف کی شاعری کی اصل قوت یہی ہے کہ وہ 'ہر دور' میں اپلائی ہو سکتی ہے کہ یہی اس کی جامعیت ہے اور یہی بڑے شاعر کی علامت ہوتی ہے۔ بظاہر یہ بات پرکشش معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ دلیل شاعری کے بنیادی فہم کی غلط تعبیر پر کھڑی ہے۔ شاعری کی جنرلائزیشن اور جنرلائزیبلٹی دو الگ چیزیں ہیں۔ جنرلائزیبلٹی وہ فکری صلاحیت ہے جس کے ذریعے ایک واضح نظریہ مختلف ادوار میں نئے سیاق و سباق کے ساتھ زندہ رہتا ہے؛ جب کہ محض جنرلائزیشن وہ مبہم پن ہے جس کے ذریعے کوئی متن ہر جگہ فِٹ ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ کسی جگہ کھڑا ہی نہیں ہوتا۔

فیض احمد فیض کا نظریہ ان کے ساتھ زندہ رہا، ان کی شاعری اس نظریے کے ساتھ جڑی رہی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے متن میں آج بھی ایک اخلاقی وژن موجود ہے۔ اسی طرح احمد فراز کی شاعری ہر دور کی شاعری ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ ہر دور میں جبر کے خلاف ہی کھڑی نظر آتی ہے۔ اقبال کی شاعری بھی ہر دور سے ہم کلام ہوتی ہے، مگر وہ ہم کلامی نظریے کی قیمت پر نہیں، نظریے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

اسی فکری تسلسل میں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ نظریاتی وابستگی کسی ایک نسل یا کسی ایک عہد تک محدود نہیں رہی۔ اسی عہد میں ایسے نوجوان اور نسبتاً کم مراعات یافتہ شعرا بھی موجود ہیں جنھوں نے نظریے کو سہولت پر قربان نہیں کیا۔ ڈاکٹر ابرار عمر کی غزلوں اور نظموں میں یہ وابستگی کسی نعرے یا خطابت کی صورت میں نہیں، بلکہ ایک مسلسل اخلاقی ذمہ داری کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ ان کی شاعری میں بھی طاقت سے فاصلے، ادارہ جاتی بے زاری، اور فکری دیانت کی قیمت ادا کرنے کا احساس واضح ہے۔ اسی طرح فرحت عباس شاہ کی نظم اور غزل میں جو اضطراب، جو سوال اور جو وجودی و سماجی کشمکش نظر آتی ہے، وہ اس بات کی شہادت ہے کہ شاعر اگر چاہے مشکل راستوں پر نظریے کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے۔ ان دونوں شعرا نے بھی یہ انتخاب کیا کہ بنیادی جذبے اور بنیادی نظریے پر کوئی آنچ نہ آنے دی جائے، خواہ اس کی قیمت تنہائی، نظر اندازی یا تاخیر سے پہچان ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے مقابلے میں افتخار عارف کی شاعری کی 'ہر دور میں اپلائی ہونے' کی صلاحیت دراصل اس کے نظریاتی خلا کا ثبوت ہے، نہ کہ اس کی وسعت کا۔ یہ وہ شاعری ہے جو کسی بھی طاقت کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے، کیوں کہ اس میں کسی طاقت کے خلاف واضح اعلانِ بغاوت موجود نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جنرلائزیشن، جنرلائزیبلٹی کا روپ دھارنے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ شاعری میں وسعت اس وقت معنی رکھتی ہے جب اس کے مرکز میں کوئی ناقابلِ مصالحت قدر موجود ہو۔ افتخار عارف کے ہاں ایسی کوئی قدر نہیں جسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنے سے انکار کریں۔ یہی فرق ہمیں جلیل عالی، اقبال، فراز، فیض، ابرار عمر اور فرحت عباس شاہ جیسے شعرا کو ایک طرف اور افتخار عارف، عباس تابش اور جون ایلیا جیسے شعرا کو دوسری طرف رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں بات پسند یا ناپسند کی نہیں، بات نظریاتی سمت کی ہے۔ جلیل عالی کمزور ہیں، خوفزدہ ہیں، پسپا ہیں، مگر وہ کسی نہ کسی فکری سمت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اقبال، فراز اور فیض نے اس سمت میں قیمت ادا کی؛ ابرار عمر اور فرحت عباس شاہ نے اسی سمت میں چلتے ہوئے سہولت سے انکار کیا۔ اس کے برعکس افتخار عارف کی شاعری کسی سمت کا تعین نہیں کرتی؛ وہ لفظوں کا جادو تو رکھتی ہے، مگر شعور کی رہنمائی نہیں کرتی۔

داخلی سطح پر ریاستی جبر کی مسلسل ضربیں ہوں یا خارجی محاذ پر مبینہ طور پر انڈیا جیسا دشمن جس کے ساتھ تصادم محض سرحدوں کا نہیں بلکہ اسی نظریے کا ہے جس پر ایک ریاست کی معنویت قائم ہے، دونوں حوالوں سے افتخار عارف کی خاموشی کسی عارفانہ وقار کا نہیں، بلکہ ایک گہری بے حسی اور فکری پسپائی کا تاثر دیتی ہے۔ یہ خاموشی نہ تو احتیاط کا نام ہے اور نہ تخلیقی توقف کا، بلکہ ایسے انخلا کی صورت ہے جس میں شاعر تاریخ کے کٹھن لمحے سے نظریں چرا کر گزر جانا چاہتا ہے۔ یوں اس مجموعی رویّے میں مزاحمت کی عدم موجودگی، عہد سے گریز اور وقت کی آنکھ میں آنکھ ڈالنے سے انکار صاف جھلکتا ہے۔

افتخار عارف پر کی جانے والی تنقید کو اگر کسی ایک فرد، ایک نام، یا ایک شخصیت کے محاسبے تک محدود سمجھا جائے تو یہ فہم کی سطحی تعبیر ہوگی۔

تنقید کا مقصد نہ تو کسی شاعر کو واحد معیارِ ادب قرار دینا ہوتا ہے اور نہ کسی ایک نام کے گرد پوری شعری روایت کو منجمد کر دینا۔ اسی طرح اگر جلیل عالی کو افتخار عارف کے مقابلے میں کسی قدر بہتر اظہار کا حامل کہا جاتا ہے تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ شاعری کا افق جلیل عالی پر ختم ہو جاتا ہے یا ان سے برتر آوازیں معدوم ہو چکی ہیں۔ ادب میں مراتب حتمی نہیں ہوتے اور نہ تخلیقی عظمت کسی ایک فیصلے میں مقید ہی کی جا سکتی ہے۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جلیل عالی کا ذکر یہاں کسی مطلق تقابل یا حتمی فیصلے کے طور پر نہیں آیا، بلکہ اس لیے آیا ہے کہ وہ افتخار عارف کے ادبی حلقے کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ تقابل اگر کیا گیا ہے تو وہ کسی بیرونی یا غیر متعلق شاعر سے نہیں بلکہ اسی حلقے کے ایک نمائندہ نام سے کیا گیا ہے، تاکہ بات تنقیدی دیانت کے ساتھ، داخلی سطح پر اور اسی دائرے کے اندر رہتے ہوئے کی جا سکے۔ بصورتِ دیگر، اگر جلیل عالی ہی کے نظریے کو بنیاد بنایا جائے خصوصاً اس اقبال پسندی کو جس کا وہ خود کو نمائندہ قرار دیتے ہیں تو اسی نظریاتی افق میں بہت سے ایسے شعرا موجود ہیں جو نہ صرف زیادہ بیباکی سے لکھ رہے ہیں بلکہ جن کی تحریر ادبی سطح پر بھی منظّم، فنی طور پر پختہ اور مزاحمتی معنویت کے اعتبار سے کہیں زیادہ معتبر ہے۔ ان کی شاعری کھوکھلے نعروں پر مشتمل نہیں بلکہ شعور، تجربے اور تخلیقی صداقت سے تشکیل پاتی ہے۔

اسی تناظر میں افتخار عارف کے ایک شعر کو مرکزِ بحث بنانا کسی شعری انتخاب کی تنگ نظری نہیں، بلکہ ایک علامتی ضرورت ہے۔ یہ شعر ہمیں وہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم مزاحمت کو محض انفرادی متن کے دائرے میں نہیں، بلکہ اس کی نمائشی، کھوکھلی اور بددیانتی پر مبنی روایت سے باہر نکل کر دیکھ سکیں۔ افتخار عارف کی تہذیبی شخصیت، ان کے ادبی مقام اور اس سے وابستہ درباری رویوں کے ساتھ یہ شعر ہمارے لیے ایک ایسا نقطۂ آغاز بن جاتا ہے جس سے گفتگو فرد سے نکل کر مزاحمت کے مجموعی بیانیے، اس کی اخلاقیات اور اس کی داخلی صداقت تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یوں یہ شعر مقصد نہیں رہتا بلکہ ایک وسیلہ بن جاتا ہے، ایک دروازہ، جس سے گزر کر ہم مزاحمت کے پورے مضمون کی مجموعیت پر بات کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

جب یہاں نظریے کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد کسی خاص فکری مکتب کی غیر مشروط وکالت نہیں ہوتی۔ نظریاتی اختلاف نہ صرف فطری ہے بلکہ ادبی صحت کا لازمی جزو بھی۔ اصل سوال نظریے کی مطابقت یا عدم مطابقت کا نہیں، بلکہ اس بات کا ہے کہ شاعر اپنے فکری شعور کو اظہار کی کس سطح پر لا پاتا ہے۔ اندرونی سچ کا بے لاگ اعتراف، اگر تخلیق میں ظاہر نہ ہو تو درست یا مقبول نظریہ بھی ادب کو زندگی نہیں دے سکتا۔ مثال کے طور پر، ایک نقاد کی حیثیت سے میں فراز کے نظریے سے پوری طرح متفق نہیں ہوں، نہ میں فیض کے فکری نظام کا نمائندہ ہی ہوں؛ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ فیض اور فراز کے ہاں اظہار کی ایک ایسی قوت، ایک ایسی داخلی صداقت اور ایک ایسی تخلیقی بے خوفی موجود ہے جو شاعر کو اس کے نظریے سے ماورا کر کے بھی معتبر بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے احساس، اپنے اختلاف اور اپنی وابستگی کو پوری دیانت کے ساتھ زبان عطا کرتے ہیں۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ جلیل عالی جس اقبالی کیمپ کے رکن ہونے کا دعوا کرتے ہیں، میں بھی اسی کیمپ کا خاک روب ہوں۔ حیرت یہ ہے کہ علی صاحب اپنی کوتاہیوں کو جواز دینے کے لیے اقبال کی فکری سمت کا رخ بھی ضعیفی کی طرف موڑ دیتے ہیں حالاں کہ اقبال جرم ضعیفی کو مرگ مفاجات کہتا ہے۔ اگر ہم موجودہ عہد کے منظرنامے پر نگاہ ڈالیں تو یہ کہنا مشکل نہیں کہ آج بھی ایسی آوازیں موجود ہیں جو بیباکی سے لکھ رہی ہیں، ادب کی حقیقی خدمت بھی کر رہی ہیں اور مزاحمت کو محض نعرہ نہیں بلکہ تخلیقی عمل بنا رہی ہیں۔ اس ضمن میں فرحت عباس شاہ، احمد فرہاد، احمد ریاض، قیوم طاہر، خالد اقبال یاسر، میاں عامر اور خاکسار جیسے شعرا ہیں، جو اپنے اپنے اسلوب میں اظہار کی دیانت، فکری جرأت اور ادبی ذمے داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تحریر محض شور نہیں بلکہ ایک بامعنی ادبی عمل ہے۔ اس کے برعکس ایک پورا ریوڑ ایسا بھی ہے جس کے ہاں نہ نظریہ واضح ہے اور نہ اظہار میں کوئی خاص صداقت، مگر وہ مزاحمت کے نام پر محض سطحی اور بے معنی بیانیہ پیدا کر رہے ہیں۔ کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جن کا مزاحمت سے کوئی تعلق ہی نہیں جیسے عدیم ہاشمی اور یہ بات بذاتِ خود کوئی جرم نہیں، کیوں کہ ہر شاعر کا تخلیقی دائرہ الگ ہوتا ہے۔

ایسے رویّوں کو بے نقاب کرنا اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف مزاحمت کے تصور کو مسخ کرتے ہیں بلکہ ادب اور قاری دونوں کے ساتھ فکری بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تنقید کا اصل فریضہ یہی ہے کہ وہ اس بددیانتی کی نشان دہی کرے، تاکہ ادب محض نعرہ نہ بنے بلکہ شعور، سچائی اور انسانی تجربے کا معتبر اظہار باقی رہ سکے۔

یہاں سوال صرف ادب کا نہیں، نسلوں کی فکری پرورش کا ہے۔ آج جب افتخار عارف جیسے لوگ اداروں، سیٹوں، اعزازات اور سرکاری مراکز میں عرصۂ دراز تک براجمان رہے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان ذہنوں کو یہ پیغام ملا کہ شاعر بننے کے لیے نظریہ ضروری نہیں تعلقات ضروری ہیں۔ اس کے برعکس جن شعرا نے نظریے پر قائم رہنے کا انتخاب کیا، وہ اگرچہ طاقت کے مراکز سے دور رہے، مگر فکری دیانت کے قریب رہے۔

E-mail: abraromer60@gmail.com
Phone No. : +923369172267

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین و مقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال) مترجم: سیّد وجاہت مظہر		500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من و تو (تحقیقی و تنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات و مضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق و توازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری و تاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-

دارالمصنّفین اور بھوپال: سو سالہ رشتے کے تناظر میں

(بقیہ صفحہ 2 سے آگے)

انھوں نے ادارے کے جشنِ طلائی 1965 میں نواب ساجدہ سلطان بیگم آف بھوپال اور مولانا عمران خاں ندوی کے ساتھ شرکت فرمائی۔ بھوپال میں 'بزمِ سلیمانی' کے انعقاد میں بھی پروفیسر دسنوی کا سرگرم تعاون رہا۔ آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا 1969 میں دارالمصنّفین کی دعوت پر اعظم گڑھ میں انعقاد ہوا، اُس میں بھوپال کے ممتاز اسکالر پروفیسر مسعود الرحمٰن ندوی نے مقالہ پیش کیا۔ سمینار کی روداد میں بھوپال کے ایک اور اسکالر پروفیسر محمد زبیر صدیقی کا نام اِس حیثیت سے درج ہے کہ سمینار کے لیے اُن کا مقالہ موصول ہوا، وہ خود شرکت نہیں کر سکے۔ 'اسلام اور مستشرقین' کے موضوع پر 1982 میں دارالمصنّفین نے ایک شاندار سمینار کی میزبانی کی، اِس میں بھوپال سے مولانا محمد عمران خاں ندوی، مولانا محمد سعید مجددی اور ڈاکٹر محمد حسان خاں نے شرکت کی جب کہ اِس کے انتظام و انصرام میں رفیق دارالمصنّفین کی حیثیت سے مولانا حافظ منصور نعمانی ندوی (بھوپالی) شریک رہے۔ دارالمصنّفین کے رفقا میں دو اور شخصیتیں ہیں، جن کا بھوپال سے گہرا رشتہ ہے: مولانا عبیداللہ کوٹی ندوی کا عہدِ طفولیت اور تعلیم کا اہم دور بھوپال میں گزرا۔ انھوں نے اپنے مادرِ علمی دارالعلوم تاج المساجد میں تدریس کی خدمات بھی انجام دیں۔ دوسرے مولانا عُمیر الصدیق ندوی ہیں، موصوف کی تعلیم بھی ندوہ سے پہلے دارالعلوم بھوپال میں ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارالمصنّفین اور بھوپال کے رشتے کی ایک کڑی دارالعلوم تاج المساجد بھی ہے، جس کے بانی و امیر مولانا محمد عمران خاں ندوی 40 سال دارالمصنّفین کے رکن رہ کر اُس کی ترقی و بہبود میں سرگرم رہے۔ دوسری جانب دارالمصنّفین کے تین ناظم مولانا شاہ معین الدین ندوی، سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ایک مہتمم مولانا مسعود علی ندوی دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن بنائے گئے۔ 'معارف' کے موجودہ ایڈیٹر مولانا عمیر الصدیق ندوی بھی مجلسِ شوریٰ میں شامل ہیں۔

(ماخذ از کلیم صفات اصلاحی 'دارالمصنّفین کے سو سال')

دارالمصنّفین اور بھوپال کے تعلق سے شخصیات اور جہات کے یہی پہلو ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعظم گڑھ اور لکھنؤ کے بعد اور حیدرآباد سے پہلے بھوپال ہی وہ شہر ہے جس نے علامہ شبلی اور اُن کی مہتم بالشان یادگار دارالمصنّفین کے قیام و استحکام میں ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔

20- گھاٹی بھڑ بھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال- 462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

مزاحمت کا فریب

افتخار عارف کے شعر کا نظریاتی محاکمہ

ڈاکٹر ابرار عمر

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں
(افتخار عارف)

خدا کے لہجے میں بولنا بذاتِ خود ایک کلیشے ترکیب ہے، ایک ایسا فقرہ جو اردو ہی نہیں بلکہ عالمی فکری وتنقیدی روایت میں مطلق العنان، غیرسوالی اور مقدس اتھارٹی کے لیے بار ہا برتا جا چکا ہے۔

لطیف شاہ شاہد کا شعر:

وہ شخص بول رہا تھا خدا کے لہجے میں
میں سن رہا تھا مگر میں کلیمِ وقت نہ تھا

یہ شعر براہِ راست اس انسانی آواز کو نشان زد کرتا ہے جو خدا کا لہجہ اوڑھ لیتی ہے۔

فرحت عباس شاہ کا شعر ملاحظہ ہو جو میری تحقیق کے مطابق 1992 میں چھپا:

وہ عشق تھا یا قیامت ہوا کے لہجے میں
یا کوئی بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

انگریزی فکری وادبی روایت میں 'خدا جیسی آواز' یا 'خدا کے لہجے' کا تصور بہت پہلے موجود اور متعین ہے۔ جان ملٹن کی نظم پیراڈائز لاسٹ میں خدا کی آواز ایسی قطعی، فیصلہ کن اور بالاتر اتھارٹی کے طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ مکالمہ نہیں بلکہ حکم بن جاتی ہے۔ یہی وہ خدا نما لہجہ ہے جسے بعد کی تنقید نے شناخت کیا۔ جدید نظری مباحث میں رولاں بارت ایسے بیانیے پر اعتراض کرتے ہیں جو خود کو آخری سچ بنا کر پیش کرے؛ ان کے نزدیک جب کوئی متن یا آواز سوال کی گنجائش ختم کر دے تو وہ انسان کی پیدا کردہ مگر خدا کی طرح بولنے والی آواز بن جاتی ہے۔ سیاسی نثر میں جارج اورویل اسی رجحان پر تنقید کرتے ہیں کہ طاقت جب بولتی ہے تو اس کا لہجہ ایسا ہوتا ہے جیسے خدا بول رہا ہو، اور فرد کے لیے اختلاف ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔ فلمی وبیانیاتی تنقید میں بل نکولس نے اسی کو 'خدا کی آواز' کہہ کر بیان کیا، یعنی وہ مقتدر آواز جو سب پر حکم چلاتی ہے۔ یہ سب شواہد اس امر کو ثابت کرتے ہیں کہ 'خدا کے لہجے' کا تصور عالمی فکری روایت میں پہلے سے راسخ ہے۔

تاہم اس مضمون میں ہم اس شعر کی جمالیاتی یا تخلیقی قوت کو موضوع نہیں بنا رہے بلکہ اس کے بظاہر مزاحمتی آہنگ، اس کی علامتی سیاست اور اس کے پسِ پشت موجود نظریاتی خلا کو پرکھنے جا رہے ہیں۔

بادی النظر میں یہ ایک طاقتور، چبھتا ہوا اور بظاہر مزاحمتی شعر محسوس ہوتا ہے۔ قاری کو فوراً یہ گمان ہوتا ہے کہ شاعر کسی جابر قوت سے مخاطب ہے، کسی مطلق العنان لہجے کو بے نقاب کر رہا ہے اور وہ وقت کو ایک اخلاقی قوت کے طور پر پیش کر کے اقتدار کے غرور کو پاش پاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہی سطحی تاثر ہے جس پر افتخار عارف کی شاعری اکثر داد سمیٹ لیتی ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ شعر کمزور ہے، مسئلہ یہ ہے کہ یہ شعر صرف تاثر ہے، موقف نہیں۔

سب سے پہلے اس شعر کے اندر موجود بنیادی ابہام کو دیکھنا ضروری ہے۔ یہاں 'رعونت' ہے مگر یہ واضح نہیں کہ رعونت کس کی ہے۔ یہاں 'خدا کے لہجے میں بولنے والا' ہے مگر یہ طے نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے: آمر؟ فوجی اسٹیبلشمنٹ؟ مذہبی پیشوا؟ ریاست؟ یا محض ایک تجریدی طاقت؟ افتخار عارف کی دوسری شاعری بشمول غزلیں اور نظمیں بھی اس شعر کی سمت متعین کرنے سے قاصر ہیں۔ افتخار عارف اس جمال شکن اور نظریہ گریز ابہام کو دانستہ برقرار رکھتے ہیں، کیوں کہ یہی ابہام ان کی شاعری کو ہر عہد، ہر اقتدار اور ہر سامع کے لیے قابلِ قبول بناتا ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جو ہر اسٹیج پر فِٹ ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس میں کسی ایک طاقت کا نام نہیں لیا جاتا، کسی ایک جبر کی نشان دہی نہیں کی جاتی اور کسی ایک سمت کا تعین نہیں کیا جاتا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں افتخار عارف کا شعر مزاحمت کے بجائے ڈرامائی خطابت بن جاتا ہے۔ یہ خطابت سامع کو لمحاتی طور پر جذباتی کر دیتی ہے، ایک وجدانی کیفیت پیدا کرتی ہے، مگر شعور کو کسی فیصلے تک نہیں پہنچاتی۔ قاری شعر پڑھ کر یہ تو محسوس کرتا ہے کہ 'کچھ غلط تھا'، مگر یہ نہیں سمجھ پاتا کہ 'کیا غلط تھا، کس نے کہا اور شاعر کہاں کھڑا ہے'۔ یہی وہ خلا ہے جو افتخار عارف کی شاعری کو نظریے سے محروم کر دیتا ہے۔

اب اگر ہم اس شعر کو شاعر کی عملی زندگی اور سماجی حیثیت کے ساتھ رکھ کر دیکھیں تو یہ تضاد اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ افتخار عارف نے پاکستان میں واپسی کے بعد جو ادبی وسرکاری سفر اختیار کیا، وہ کسی ایک دور یا ایک حکومت تک محدود نہیں رہا۔ انھوں نے مختلف سیاسی ادوار میں خود کو اس طرح ایڈجسٹ کیا کہ ان کی حیثیت، مراعات، گاڑی، دفتر اور ادارہ جاتی طاقت کبھی خطرے میں نہیں پڑی۔ ایسے میں جب وہ 'خدا کے لہجے میں بولنے والے' پر تنقید کا تاثر دیتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لہجہ آخر کس کے خلاف ہے، جب خود شاعر ہر طاقتور کے لہجے سے ہم آہنگ رہا ہو۔

یہ شعر دراصل اس بنیادی اخلاقی امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے جو ہر بڑے شاعر کے سامنے آتا ہے: کیا شاعر اپنے الفاظ کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہے؟ افتخار عارف کے ہاں جواب نفی میں ملتا ہے۔ ان کے ہاں لفظ ہیں، آہنگ ہے، صوتی جلال ہے، مگر وہ خطرہ نہیں ہے جو کسی شعر کو تاریخی بنا دیتا ہے۔ یہ شعر کسی ڈکٹیٹر کو بے چین نہیں کرتا، کسی ریاستی ادارے کو ناگوار نہیں گزرتا، کسی طاقتور کو صفائی دینے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس کے برعکس، یہ شعر اقتدار کے ایوانوں میں بھی پڑھا جا سکتا ہے اور وہاں بھی داد پا سکتا ہے، کیوں کہ اس میں الزام نہیں، صرف ایک مبہم اخلاقی اشارہ ہے۔

یہی فرق افتخار عارف اور حقیقی مزاحمتی شاعری کے درمیان لکیر کھینچ دیتا ہے۔ افتخار عارف کے یہاں 'وقت' ایک رومانوی استعارہ ہے جو سب کچھ خود ہی درست کر دیتا ہے، گویا شاعر کو کسی عملی یا اخلاقی موقف کی ضرورت ہی نہیں۔ وقت آتا ہے، رعونت خاک ہو جاتی ہے شاعر محفوظ رہتا ہے۔ یہ تصور دراصل شاعر کو کٹہرے سے بچا لیتا ہے، مگر تاریخ کے کٹہرے سے نہیں بچاتا۔ یہاں شاعر مزاحمت نہیں کرتا، وہ صرف یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتا ہے کہ 'وقت سب دیکھ لے گا'۔

اس کے مقابلے میں نظریاتی شاعری وقت کے رحم وکرم پر نہیں ہوتی، وہ خود وقت کے خلاف کھڑی ہوتی ہے۔ افتخار عارف کا شعر وقت کے ساتھ کھڑا ہے، وقت کے خلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر جتنا پُر جوش لگتا ہے، اتنا ہی بے ضرر ہے۔ یہ ایک ایسا شعر ہے جو سننے والے کو وقتی طور پر یہ احساس دیتا ہے کہ 'کچھ کہہ دیا گیا ہے'، حالاں کہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں افتخار عارف کی شاعری ایک ادبی اداکاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اداکاری میں لہجہ، مکالمہ اور تاثر سب کچھ ہوتا ہے، مگر کردار کے پیچھے کوئی حقیقی وابستگی نہیں ہوتی۔ افتخار عارف کے اس شعر میں بھی ایک کردار ہے جو کسی خدا نما لہجے پر سوال اٹھا رہا ہے، مگر شاعر خود اس کردار میں مکمل طور پر داخل نہیں ہوتا۔ وہ اس کردار کو ادا کر کے اسٹیج سے اتر جاتا ہے اور اس کی عملی زندگی اسی اقتدار کے ساتھ رواں دواں رہتی ہے جس پر شعر میں بظاہر انگلی اٹھائی گئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ اس شعر کو اگر افتخار عارف کی مجموعی شاعری اور زندگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ مزاحمت نہیں بلکہ محفوظ جذباتیت بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جو کسی بھی نظام کے لیے خطرہ نہیں بنتی، بلکہ نظام کے اندر رہتے ہوئے اسے ایک اخلاقی ملمع فراہم کرتی ہے۔ اس شعر کے ذریعے شاعر یہ تاثر دیتا ہے کہ 'میں نے سوال اٹھا دیا'، جب کہ درحقیقت اس نے صرف ایک ایسا سوال پیدا کیا ہے جس کا کوئی مخاطَب نہیں۔

...(بقیہ صفحہ 6 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722